QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

اقبال بحیثیتِ جدید متکلم: اسلامی علمِ کلام کی فکری تشکیلِ نو

Iqbal as a Modern Theologian: The Intellectual Reconstruction of Islamic Kalam

ڈاکٹر حسن رضا (اقبالی)

استاذ ادبیات اردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج، اوکاڑہ، پاکستان۔

پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین

ڈائریکٹر، شعبہ زبان وادبیات اردو، اورینٹل کالج، یونیورسٹی آف دی پنجاب، لاہور، پاکستان۔

Abstract

This paper examines Allama Muhammad Iqbal's reconstruction of Islamic theology (ʿIlm al-Kalām) in the light of modern intellectual, scientific, and civilizational challenges. Departing from purely logical and polemical approaches of classical theologians, Iqbal grounds religious belief in lived experience, ethical vitality, and historical effectiveness. Central to his theological vision is the concept of khudī (selfhood), through which he reinterprets tawḥīd, prophethood, and human responsibility as dynamic and action-oriented realities. Iqbal views tawḥīd not merely as a doctrinal assertion but as a principle of unity in thought and collective practice. He advances a novel proof of prophethood by emphasizing the Prophet's role in creating a morally unified and historically transformative community. Integrating revelation, reason, intuition, and modern science, Iqbal presents a creative and forward-looking theology that renews Islamic thought for the contemporary world.

Keywords: *Allama Muhammad Iqbal; Islamic Theology (ʿIlm al-Kalām); Reconstruction of Religious Thought; Khudī (Selfhood); Tawḥīd and Unity of Action; Prophethood; Revelation and Reason; Modern Islamic Thought*

علمِ کلام وہ اسلامی علمی روایت ہے جس میں عقائدِ اسلامیہ کا اثبات عقلی دلائل کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ تاہم فارسی شاعری کے ارتقا کے ساتھ یہ دائرہ محض جذبات تک محدود نہ رہا، بلکہ فلسفہ، اخلاق، تصوف اور شریعت کے بنیادی مسائل بھی شاعری کا حصہ بن گئے۔ ایرانی صوفی شعرا خصوصاً حکیم سنائی غزنوی، مرزا صائب تبریزی، عرفی شیرازی اور بالخصوص مولانا روم نے ان مسائل کو عقلی منطق کے بجائے خطابی و شاعرانہ اسلوب میں اس درجہ مؤثر انداز سے پیش کیا کہ ان کا بیان قدیم علمِ کلام کے خشک عقلی دلائل سے زیادہ دل نشین اور قریب الفہم بن گیا۔

اردو شاعری اگرچہ فارسی روایت سے وابستہ رہی، مگر بدقسمتی سے اس نے اس فکری ورثے کو پوری معنویت کے ساتھ منتقل نہ کیا۔ اردو شعرا میں اکبر الٰہ آبادی کے بعد ڈاکٹر علامہ محمد اقبال واحد شاعر ہیں جنھوں نے غزل و قصیدہ کی محدود فضا سے نکل کر تصوف، اخلاق، فلسفہ اور اسرارِ شریعت کو ایک ہمہ گیر فکری نظام کے طور پر شاعری میں سمویا۔

قدیم متکلمین نے وجودِ باری تعالیٰ، توحید، نبوت اور حشر و نشر جیسے عقائد کا اثبات محض عقلی استدلال سے کیا، مگر ان دلائل سے ان عقائد کے عملی و تمدنی نتائج پوری طرح واضح نہ ہو سکے۔ اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے امام غزالی اور امام رازی نے نظری کے بجائے عملی نتائج کی بنیاد پر نبوت و رسالت کے اثبات کی طرف توجہ دی، جب کہ صوفی شعرا نے اسے شاعرانہ اور خطابی انداز میں مزید مؤثر بنا دیا۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

اقبال کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی شاعری جدید تہذیب، سائنسی شعور اور عملی فکر کے ماحول میں پروان چڑھی۔ اسی لیے انھوں نے اسلامی عقائد کا اثبات محض نظری سطح پر نہیں بلکہ ان کے عملی اثرات اور تمدنی نتائج کے ذریعے کیا۔ فلسفۂ خودی اقبال کے علمِ کلام کی اساس ہے، جس کے ذریعے وہ توحید، نبوت اور انسانی ذمہ داری کے مفاہیم کو ایک زندہ اور متحرک تصور میں ڈھال دیتے ہیں۔

اقبال کا علمِ کلام قدیم متکلمین اور صوفی شعرا کی روایت سے مربوط ہونے کے باوجود اپنے اسلوب، مقصد اور اثر میں جدید ذہن کے زیادہ قریب اور عصرِ حاضر کے فکری رجحانات سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اقبال نے بھی ایک متکلم کی طرح الہیات اسلامیہ کی تعمیر نو اور تشکیل جدید کی کوشش کی اور ان کا اس سلسلے میں سب سے اہم کام اُن کے خطبات ہیں۔ اقبال نے جو فلسفہ پڑھا تھا اسے اپنے عقاید اسلامی کی عقلی اور فلسفیانہ توجیہ و توثیق کیلئے بڑے مستحسن طریقے سے استعمال کیا۔ لیکن اقبال سمجھتے تھے کہ علم کلام صرف ذہنی کاوشوں پر مشتمل نہ ہو اور اس میں صرف فلسفیانہ موشگافیاں ہی نہ ہوں بلکہ یہ زندگی کی حرکی قوت کا ترجمان اور فکرِ نو کی تعمیر کرنے والا مجتہدانہ علم کلام ہو، اس لیے انھوں نے کلام کی فرسودہ روش کو غیر مستحسن قرار دیا :

طبع مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علم کلام ( )
کلام و فلسفہ از لوحِ دل فرو شستم
ضمیر خویش کشادم بہ نشترِ تحقیق ( )
(میں نے اپنے دل کی تختی پر سے فلسفہ اور کلام کو دھو ڈالا اور تحقیق کے نشتر سے اپنے ضمیر کو کھرچا، تب دل کی حقیقت کھلی)
حکمتی کو عقدہ اشیا کشاد
با تو غیر از فکر چنگیزی نداد ( )
(وہ علم جو مادی وسائل بہم پہنچاتا ہے انسان کو دوسروں کی دولت سے چنگیز کی طرح ہوسناک نگاہوں سے دیکھنے کا عادی بنا دیتا ہے)

برصغیر میں جدید علم الکلام کے حوالے سے علامہ اقبال کو اہم مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ اس وجہ سے انھیں جدید متکلم کے طور پر جانا جاتا ہے۔ وہ امام رازی اور امام غزالی کی طرح ایک متکلم ہیں مگر ان میں فرق یہ ہے کہ امام رازی اور امام غزالی نے فلسفہ اور مذہبی عقائد میں تطبیق کرنے کی کوشش کی جب کہ علامہ اقبال نے سائنس اور مذہبی مسلمات میں مفاہمت کرنے کی سعی کی۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں :

"امام غزالی نے فلسفہ کی تردید کی تو انھوں نے علم کلام اور فلسفہ کے مسائل کو باہم مخلوط کر دیا۔ امام رازی نے مباحث شرقیہ میں یہی روش اختیار کی اور ان کے بعد علمائے کلام نے اس کی تقلید کی اور علم کلام اور فلسفہ حکمت کے تمام مسائل مخلوط ہو کر ایک معجون مرکب تیار ہو گیا۔" ( )

امام غزالی سے قبل فلسفہ اور علم کلام میں حد فاصل تھی۔ اس کے بعد علم کلام کو بھی فلسفہ ہی سمجھا جانے لگا۔ اقبال کو بھی اسی وجہ سے فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ حال آں کہ انھوں نے علم الکلام کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں جدید علمی رجحانات وانکشافات کی روشنی میں الہیات اسلامیہ کو از سر نو مرتب کرنے کی کوشش کی۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

اس سلسلے میں سید وحید الدین لکھتے ہیں :

"جن مفکرین نے وقت کی نزاکت کو محسوس کیا اور اسلامی فکر کی تشکیل کے مسئلے کو عصری فلسفہ اور جدید سائنس کے رجحانات کی روشنی میں سوچا اور متفقہ مسائل کو نئے سرے سے تعین کیا ان میں اقبال کا مخصوص مقام ہے۔"(🗄)

علامہ اقبال مسلمان متکلمین میں اس لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتے ہیں کہ وہ جدید مغربی فلسفہ کے عالم تھے اور اسی لیے ان کی اسے مسلمان بنانے کی کوششیں زیادہ موقر و موثر ہیں۔اقبال نے خواجہ غلام السیدین کو لکھا تھا:

"علم (شے) سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر مبنی ہے، عام طور پر میں نے علم کا لفظ انھی معنوں میں استعمال یا ہے۔اس علم میں ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رکھنا چاہیئے۔اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو شیطنت ہے۔یہ علم، علم حق کی ابتدا ہے۔"(⌛)

جیسا کہ میں نے جاوید نامہ میں لکھا ہے:

علم حق اول حواس، آخر حضور
آخر او می نگنجد در شعور(🖮)

(حقیقت مطلقہ کا علم حاصل کرنے کے لیے علم اشیاء حاصل کرنا ضروری ہے بلکہ علم بالحواس ہی خدا تک رسائی کا ذریعہ ہے ورنہ تو حقیقت مطلقہ کا شعور ہی نہ کیا جا سکے)

اقبال نے انھی خیالات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے علم طبعی کو دین کے ماتحت بنانے کی کوششیں کیں اور وہ اس دور کے بہت بڑے متکلم تھے۔یہ ضرور ہے کہ ان کا نظریہ فلسفیانہ اور محققانہ تھا جیسا کہ "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا" میں لیکن بعد میں تجدید و احیائے دین کا جذبہ غالب آیا اور وہ ۱۹۱۲ میں مولانا شبلی نعمانی کی قائم کی ہوئی، مجلس علم کلام کے رکن بھی بن گئے۔اقبال کے اپنے الفاظ میں ''نظریہ حیات فلسفیانہ جستجو سے حاصل نہیں کیا، زندگی کے متعلق ایک خاص زاویہ نگاہ ورثے میں مل گیا تھا بعد میں، میں نے عقلی استدلال کو اس کے اثبات میں صرف کیا''۔(🖱)

اس تناظر میں ڈاکٹر محمد اقبال کا علمِ کلام اپنی ایک منفرد اور عصری حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ انھوں نے اسلامی عقائد کے محض نظری و عقلی اثبات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے عملی، اخلاقی اور تمدنی نتائج کو اپنی شاعری اور فکر کا مرکز بنایا۔

اقبال کے نزدیک توحید، نبوت اور حیاتِ اخروی محض تجریدی تصورات نہیں بلکہ ایسے زندہ حقائق ہیں جو فرد کی خودی کو بیدار کرتے اور اجتماعی زندگی کو حرکت و توانائی عطا کرتے ہیں۔انھوں نے قدیم متکلمین کے منطقی استدلال اور صوفی شعرا کے وجدانی و خطابی اسلوب کو جدید سائنسی شعور، تاریخی آگہی اور عملی تجربے کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایک نیا کلامی اسلوب تشکیل دیا، جس میں ایمان عمل سے، عقیدہ زندگی سے اور فکر تمدن سے جڑ جاتی ہے۔خودی کا فلسفہ دراصل اقبال کے علمِ کلام کی روح ہے، جس کے ذریعے وہ اسلامی عقائد کو ایک فعال، متحرک اور زندگی ساز قوت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اسی بنا پر ان کا کلامی طرزِ فکر نہ صرف قدیم روایت کا تسلسل ہے بلکہ جدید ذہن کے لیے زیادہ بامعنی، مؤثر اور قابل قبول بھی ہے۔

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

اقبال نہ صرف اسلامی افکار و تصورات میں قدیم علماء کے وارث تھے، بلکہ ان کی نظر مغربی افکار و علوم پر بھی نہایت گہری تھی۔ وہ اس کے پس منظر، اساس اور اس کی خامیوں اور کمزوریوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ چناں چہ ایک طرف انھوں نے اصل اسلامی معتقدات و تصورات کی جمہور علماء کے انداز میں بھرپور ترجمانی کی ہے اور دوسری طرف افکار مغربی پر نہایت دور رس اور کڑی تنقید کر کے ذہنوں کو اس کے رعب اور دبدبے سے نجات دلائی ہے۔ اقبال نے یہ اصلاحی کارنامہ خشک، کلامی دلائل اور دور از کار تاویلوں کے بجائے شعر کے مؤثر اور پر سوز ذریعے سے انجام دیا ہے۔ ان کا خطاب دماغ سے نہیں دل سے ہے۔ وہ عقلی اور منطقی استدلال سے زیادہ تجربہ روحانی اور مشاہدہ و وجدان پر زور دیتے ہیں۔ بقول نکلسن :

"اقبال کا شعر ان کی منطق سے زیادہ کامیاب ہے۔" (✆~)

جہاں ان کی منطق بات سمجھانے میں ناکام رہتی ہے وہاں ان کا شعر دلوں کو مطمئن کرتا اور عمل پر ابھارتا ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اقبال کے ایک ایک شعر میں دلوں کو گرمانے اور انھیں آمادہ عمل کرنے کی جو قدرت ہے بڑے بڑے مدلل خطبات اس سے قاصر ہیں۔ اقبال کے اصلاحی کام کا نقطہ آغاز ان کا فلسفہ اثبات خودی ہے۔ جہاں سے چل کر وہ ذات خداوندی، رسالت محمدی صلی اللہ علیہ والہ وسلم، وحی و معجزات، ملائکہ و قیامت، جبر و قدر وغیرہ جیسے مہمات مسائل کے بارے میں دلوں سے شکوک و شبہات کے کانٹے نکالتے اور انھیں ایمان وایقان کی دولت لازوال سے مالا مال کرتے ہیں اور عالم انسانیت کی فلاح اور اس کے دکھوں کا مداوا تعلیمات قرآنی کی پیروی کو قرار دیتے ہیں۔

ذیل میں مندرجہ مسائل کے متعلق اقبال کی تصریحات مختصراً پیش کی جاتی ہیں :

توحید باری تعالیٰ: اقبال کے علمِ کلام کی اساس

توحیدِ باری تعالیٰ محض ایک نظری یا عقلی عقیدہ نہیں بلکہ ایک عملی اصولِ حیات ہے۔ صرف ایک خدا کے وجود کا اقرار توحید کی کامل صورت نہیں، بلکہ توحید اس وقت مکمل ہوتی ہے جب اس کے ماننے والوں میں عملی اتحاد پیدا ہو۔ اگر مسلمان اپنے اعمال، اجتماعی نظم، اخلاق اور معاشرت میں متحد نہ ہوں تو محض اعتقادی توحید ایک مردہ تصور بن کر رہ جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے نزدیک اسلام نے توحید پر جو غیر معمولی زور دیا، اس کا مقصد مسلمانوں میں وحدتِ کردار پیدا کرنا تھا۔ لیکن فقہی اور کلامی اختلافات نے مسلمانوں کے اعمال میں ناہمواری پیدا کر دی، جس کے نتیجے میں وہ عملی اتحاد باقی نہ رہا جو دورِ صحابہؓ میں موجود تھا۔ اسی بنا پر اقبال فقہا اور متکلمین دونوں پر تنقید کرتے ہیں کہ انھوں نے توحید کو ایک زندہ، انقلابی قوت کے بجائے محض علمِ کلام کا مسئلہ بنا دیا۔ اقبال کے یہ اشعار اسی فکری موقف کی ترجمانی کرتے ہیں:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام (📂📁)

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک توحید، وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار کے امتزاج کا نام ہے۔ فکر کی وحدت اگر عمل کی وحدت سے خالی ہو تو وہ نامکمل اور بے اثر رہتی ہے۔

مکی دور میں رسولِ اکرم ﷺ نے بنیادی طور پر توحید کی فکری تعلیم دی، جس کا تعلق عقیدہ اور شعور سے تھا۔اس تعلیم نے جب ایک متحد العقیدہ جماعت تیار کر دی تو مدنی دور میں احکام و فرائض نازل ہوئے، جن کے ذریعے وحدتِ کردار کی تشکیل ہوئی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جہاں مسلمانوں کی اجتماعی اور عملی زندگی کا آغاز ہوا۔اسی عملی توحید کی قوت سے مسلمانوں نے عرب کے مشرکین، روم کے نصاریٰ اور خیبر کے یہودیوں کا مقابلہ کیا اور ایک منظم اور زندہ تمدن قائم کیا۔

اقبال کے نزدیک اسلام کی توحید دراصل ایک حرکی، جذباتی اور عملی طاقت تھی، کیوں کہ دنیا کی تاریخ محض عقلی تصورات سے نہیں، بلکہ زندہ جذبات اور عملی ارادوں سے تشکیل پاتی ہے۔ مگر جب متکلمین اور فقہانے توحید کو محض منطقی اور فلسفیانہ بحث بنادیا تو اس کی فطری حرارت ختم ہو گئی اور امت میں انحطاط کا آغاز ہوا۔اسی نکتے کو اقبال نے پیامِ مشرق میں نہایت جامع انداز میں بیان کیا ہے:

عمل خواہی یقین را پختہ تر کن
یکے جوئے و یکے بین و یکے باش (🗁🗁)

(یعنی اگر یقین کو مضبوط کرنا چاہتے ہو تو عمل اختیار کرو؛ ایک ہی حقیقت کو تلاش کرو، ایک ہی کو دیکھو اور ایک ہی بن جاؤ۔)

علامہ اقبال کا علمِ کلام محض نظری مباحث کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک عملی دعوت ہے۔ان کے نزدیک توحید کا حقیقی مفہوم اسی وقت سامنے آتا ہے جب وہ مسلمانوں کے افکار، کردار اور اجتماعی نظام میں وحدت پیدا کرے۔ اگر مسلمانوں میں اتحادِ عمل موجود نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی توحید بھی نامکمل ہے۔یہی وہ فکری نکتہ ہے جو اقبال کے علمِ کلام کو روایت سے ممتاز اور عصرِ حاضر کے لیے معنویت سے بھرپور بناتا ہے۔

اقبال کے نزدیک توحید وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار کے امتزاج کا نام ہے۔ مکی دور میں توحید نے وحدتِ افکار پیدا کی، اور مدنی دور میں اسی وحدتِ فکر نے وحدتِ کردار کی شکل اختیار کی، جس سے ایک زندہ، متحرک اور غالب قوم وجود میں آئی۔

وحدتِ افکار سے مراد یہ ہے کہ کسی قوم کے افراد کے بنیادی اعتقادات، فکری نصب العین، اقدار اور زندگی کے مقصد میں ہم آہنگی ہو۔ مکی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا محور یہی وحدتِ افکار تھا۔اس دور میں کوئی سیاسی اقتدار نہیں تھا، کوئی ریاستی نظام نہیں تھا لیکن ایک متحد العقیدہ جماعت تیار ہو رہی تھی۔

اقبال کے نزدیک وحدتِ افکار محض نظری ہم آہنگی نہیں بلکہ ایک اندرونی روحانی یک جہتی ہے، جو انسان کے شعور، ارادے اور نصب العین کو ایک مرکز پر لا کھڑا کرتی ہے۔تاہم اگر وحدتِ افکار، عمل میں نہ ڈھلے تو وہ محض ذہنی تجرید بن کر رہ جاتی ہے، جسے اقبال نے "فقط اک مسئلۂ علمِ کلام" کہا ہے۔وحدتِ کردار سے مراد یہ ہے کہ قوم کے افراد کے اعمال، نظمِ اخلاقی رویے، سیاسی و سماجی طرزِ عمل، ایک مشترک دینی اصول کے تابع ہوں۔ شریعت کے احکام نازل ہوئے۔اجتماعی عبادات (نماز، زکوٰۃ، جہاد) منظم ہوئیں ریاست، قانون اور نظمِ اجتماعی وجود میں آیا یہی وحدتِ کردار تھی جس نے مسلمانوں کو مشرکینِ عرب، رومی نصاریٰ، یہودیانِ خیبر پر غالب کر دیا۔وحدتِ کردار کے بغیر وحدتِ افکار ایک ناپختہ اور خام تصور ہے۔اسی لیے وہ فرماتے ہیں:

وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام (🗁🗎)

فقہی اختلافات جب کردار کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیں تو توحید اپنی عملی روح کھو دیتی ہے، چاہے عقیدہ زبان سے کتنا ہی درست کیوں نہ ہو۔اسی لیے اقبال کا شکوہ بالکل بجا ہے:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی

آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام (🗏🗀)

اثباتِ نبوت ورسالت:

علمِ کلام کی روایت میں نبوت کا اثبات عموماً معجزہ کے ذریعے کیا گیا ہے۔ چونکہ نبوت بذاتِ خود ایک غیر معمولی حقیقت ہے، اس لیے اس کے ثبوت کے لیے بھی غیر معمولی دلیل کو ضروری سمجھا گیا، اور اسی بنا پر اشاعرہ نے معجزۂ حسی کو دلیلِ نبوت قرار دیا۔ تاہم یہ طریقۂ استدلال عقلی اعتبار سے متعدد اشکالات سے خالی نہ تھا، کیونکہ مافوق الفطرت افعال بعض اوقات ساحروں اور شعبدہ بازوں سے بھی صادر ہو جاتے ہیں۔ اسی عقلی دشواری کے پیشِ نظر امام غزالی، امام فخر الدین رازی اور مولانا رومؒ جیسے مفکرین نے معجزۂ حسی کے بجائے تعلیماتِ انبیاء اور ان کے اخلاقی و روحانی نتائج کو نبوت کی اصل دلیل قرار دیا۔ ان کے نزدیک پیغمبروں کی تعلیمات سے پیدا ہونے والا تزکیۂ نفس، تہذیبِ اخلاق اور انسانی تعمیر ایسی خصوصیات ہیں جو جادو یا شعبدہ بازی کے دائرے سے ماوراہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال اس روایت کو ایک بالکل نئے زاویے سے آگے بڑھاتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک نبوت کا سب سے بڑا معجزہ ایک زندہ، باعمل اور تاریخ ساز قوم کی تخلیق ہے۔ جدید قومی و اجتماعی شعور کے تناظر میں یہی دلیل زیادہ بامعنی اور مؤثر ہے۔ ساحر حیرت انگیز کرشمے دکھا سکتا ہے، مگر وہ کسی قوم کو اخلاقی وحدت، عملی نظم اور تاریخی شعور عطا نہیں کر سکتا۔ فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰؑ کے معجزات کا ظاہری مقابلہ تو کر سکے، مگر بنی اسرائیل جیسی زندہ اور بامقصد قوم پیدا نہ کر سکے۔

اقبال کے نزدیک نبوت محض انفرادی زہد، خلوت گزینی اور اخلاقی تطہیر تک محدود نہیں، بلکہ وہ تاریخ میں ایک نئے اجتماعی شعور اور عملی نظامِ حیات کو جنم دیتی ہے۔ اسی لیے وہ صوفیانہ زہد اور نبوی رسالت میں واضح فرق قائم کرتے ہیں۔ زہد فرد کو سنوارتا ہے، جب کہ نبوت انسانیت کی تقدیر بدل دیتی ہے۔

یوں اقبال کے ہاں نبوت کا اثبات نہ محض خرقِ عادت سے ہوتا ہے، نہ صرف اخلاقی وعظ سے، بلکہ اس ہمہ گیر انقلابی قوت سے جو ایک منتشر انسانیت کو قوم، ایک خیال کو تاریخ اور ایک پیغام کو زندہ تہذیب میں بدل دیتی ہے۔

صوفیت فرد کو سنوارتی اور اخلاقی تطہیر کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ نبوت انسانیت کی اجتماعی تقدیر بدلتی ہے، ایک نظامِ عملی اور تاریخی شعور تخلیق کرتی ہے۔ اقبال کے اشعار میں یہ تصور واضح ہے:

از وجودش اعتبارِ ممکنات

اعتدال او عیارِ ممکنات (🗏🗀)

یعنی نبوت کا اثبات نہ محض مافوق الفطرت اعمال یا اخلاقی وعظ سے ہوتا ہے، بلکہ اس کی اصل دلیل ایک منتشر انسانیت کو قوم میں بدل دینے، تاریخی اور اخلاقی شعور پیدا کرنے کی قوت ہے۔

یہ نقطۂ نظر نہ صرف کلاسیکی علماء جیسے غزالی و رازی کی فکر سے منفرد ہے، بلکہ جدید قومی و تاریخی شعور کے عین مطابق بھی ہے، جو ڈاکٹر اقبال کو علمِ کلام میں ایک نئے اور مؤثر زاویہ سے ممتاز کرتا ہے۔

وحی والہام 💻

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

ڈاکٹر اقبال کے نزدیک برے بھلے کی تمیز صرف عقل سے نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لیے وحی و الہام کی ضرورت ہے، لیکن جس طرح انسان قوت ذائقہ سے لذیذ و غیر لذیذ کھانے کا اور قوت لامسہ کے ذریعہ سے نرم و سخت جسم کا احساس کر سکتا ہے بعینہ اسی طرح انسان کے اندر ایک قوت ہے جو اچھے اور برے کاموں کی تمیز کر سکتی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اور قوتیں صرف مادیات سے تعلق رکھتی ہیں، اور یہ قوت روحانیات سے تعلق رکھتی ہے لیکن بہر حال زندگی کی نشو و نما کے لیے یہ قوت خود زندگی ہی کے اندر موجود ہے۔

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کار حیات
فکر بے نور ترا، جذب عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تار حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات(📂⌛)

جس طرح ذوقی چیزوں کی تمیز میں عقل بالکل بیکار ہو جاتی ہے، صاف و شفاف پانی کو دیکھ کر صرف عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ وہ شور ہے یا شیریں ؟اس کا فیصلہ صرف ذوق کر سکتا ہے، اسی طرح بہت سے افعال کے حسن و قبح کا فیصلہ بھی عقل نہیں کر سکتی، بلکہ خود زندگی ہی یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ کون سے فعال زندگی کے لیے موزوں ہیں اور کون سے غیر موزوں؛ اسی ذوقی احساس کا نام وحی یا الہام ہے، باقی رہا وحی والہام کی حالت میں آواز کا آنا، فرشتے کی شکل کا نہ آنا، ڈاکٹر اقبال اس کے منکر ہیں نہ مقر، ممکن ہے کہ جس طرح بھوک پیاس اور دوسرے جسمانی احساسات میں انسان پر خاص خاص حالات طاری ہوتے ہیں اسی طرح روحانی احساسات میں بھی انسان پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہوں۔ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے ہاں وحی والہام نہ صرف ایک کلامیہ مسئلہ ہے بلکہ انسان کی عملی، اخلاقی اور روحانی رہنمائی کا بنیادی ذریعہ ہے۔اقبال کے نزدیک وحی ایک روحانی ذوق ہے جو انسان کے اندر فطری طور پر موجود ہے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل میں درست فیصلہ کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔

اقبال عقل کو مادی اور ظاہری حقائق تک محدود سمجھتے ہیں۔ عقل صرف مادی مظاہر اور ظاہری حقائق کا ادراک کر سکتی ہے، لیکن اعمال کے حسن و قبح کا فیصلہ عقل سے ممکن نہیں، اس کے لیے ایک روحانی قوت یا ذوق وحیانی کی ضرورت ہے جو انسان کو اچھے اور برے اعمال کی تمیز سکھائے۔

"راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کار حیات
فکر بے نور ترا، جذب عمل بے بنیاد"(📂⌨)

یہ اشعار واضح کرتے ہیں کہ عقل اور تخمین کے بغیر فکر اور عمل کی بنیاد کمزور اور غیر مؤثر رہ جاتی ہے، اور روحانی رہنمائی کے بغیر انسان کی زندگی اندھی اور بے سمت رہ جاتی ہے۔

یہ انسان کے اعمال کی تمیز اور صحیح راہ متعین کرتی ہے، عقل سے بالاتر ہے اور زندگی کے عملی فیصلوں میں سند و ضابطہ فراہم کرتی ہے، انسان کی فکر و عمل کی بنیاد مضبوط اور معنی خیز بناتی ہے، بغیر وحی کے، انسان کی زندگی اندھی اور بے بنیاد رہ جاتی ہے۔اقبال ایک مثال کے ذریعے وحی کی وضاحت کرتے ہیں: جس طرح صاف و شفاف پانی کو دیکھ کر عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ یہ شیریں ہے یا شور، اسی طرح اچھے اور برے اعمال کا فیصلہ بھی

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

عقل نہیں کر سکتی، بلکہ زندگی خود یہ فیصلہ کرتی ہے۔ یہ مثال وحی کو روحانی ذوق اور داخلی شعور (Insight) کے طور پر واضح کرتی ہے، جو انسانی زندگی کے فیصلہ کن امور میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں وحی کی حقیقت کو مختلف اشعار میں اجاگر کیا گیا ہے، جیسے :

"خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات" (🖰🗁)

یہ شعر واضح کرتا ہے کہ اعمال کے حسن و قبح کا فیصلہ صرف زندگی اور روحانی شعور (حیات و وحی) کے ذریعے ممکن ہے، عقل یا ظاہری مظاہر سے نہیں۔ صرف سماعی یا ظاہری مظہر نہیں، بلکہ ایک روحانی ذوق اور داخلی شعور ہے، عقل سے بالاتر ہے اور انسان کو اخلاقی، عملی اور روحانی رہنمائی فراہم کرتی ہے، زندگی کے پیچیدہ فیصلوں میں سند و معیار مہیا کرتی ہے اور انسانی فکر و عمل کی بنیاد کو مضبوط اور معنی خیز بناتی ہے۔ یوں، اقبال کے نزدیک وحی نہ صرف کلامیہ مسئلہ ہے بلکہ ایک عملی ضرورت بھی ہے، جو انسان کی زندگی کو نظم، رہنمائی اور بصیرت عطا کرتی ہے۔

علمِ کلام کی روایت اور جدید چیلنجز:

علمِ کلام اسلامی علوم میں وہ بنیادی علم ہے جس کا مقصد اسلامی عقائد کا دفاع، توضیح اور عقلی استدلال کے ذریعے ان کی توجیہ ہے۔ روایتی علمِ کلام نے اسلامی تاریخ میں ایک عظیم خدمت انجام دی، تاہم جدید عہد میں سائنسی، فلسفیانہ اور فکری انقلابات نے مذہبی فکر کو نئے چیلنجز سے دوچار کر دیا۔ ایسے میں علامہ محمد اقبالؒ ایک ایسے مفکر کے طور پر سامنے آتے ہیں جنھوں نے علمِ کلام کو محض ماضی کی فکری روایت نہیں رہنے دیا بلکہ اسے جدید انسانی شعور، سائنسی فکر اور فلسفۂ حیات سے ہم آہنگ کرنے کی شعوری کوشش کی۔ اقبال کا علمِ کلام جامد نہیں بلکہ متحرک، تخلیقی اور حیات آفریں ہے۔ کلاسیکی علمِ کلام (اشعری، معتزلی، ماتریدی) نے اپنے دور کے فکری سوالات کا جواب فراہم کیا، مگر جدید یورپی فلسفہ، مادّیت، تجربیت، ڈارونیت، ہیگلین جدلیات اور نطشے کے تصورِ فوق البشر نے مذہبی فکر کو دفاعی پوزیشن پر لا کھڑا کیا۔

اقبال کے نزدیک مسئلہ یہ نہیں تھا کہ اسلام میں فکری کمزوری ہے، بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ اسلامی فکر کو نئے تجربے اور نئے تناظر میں از سرِ نو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کے نزدیک علمِ کلام محض عقائد کا منطقی دفاع نہیں بلکہ زندگی کی تعبیر ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ: "دین کوئی مجرد نظریہ نہیں بلکہ ایک زندہ تجربہ ہے۔" (🗁🙞)

اقبال کا علمِ کلام تین بنیادی اصولوں پر قائم ہے:

🗁۔ تجربۂ باطنی (Religious Experience)

🗎۔ حرکت و ارتقا (Dynamic Reality)

🗏۔ خودی (Ego / Self)

یہی عناصر ان کے کلامی نظام کو روایتی مناظرانہ علمِ کلام سے ممتاز کرتے ہیں۔

زمان و مکان💻

اقبال کے نزدیک زمانے کی دو قسمیں ہیں:

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

ایک زمان مسلسل اور ایک زمانہ خالص۔ زمان مسلسل وہ ہے جو گردش زمین کا رہین منت ہے اس کے روز کو صبح دوپہر اور شام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ زمان خالص یا زمان حقیقی وہ زمانہ ہے جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں اس کا روز ایسا ہے جو کبھی غروب نہیں ہوتا اس میں نہ صبح ہے نہ شام نہ اس کا ماضی ہے نہ استقبال صرف حال ہے کبھی نہ ختم ہونے والا حال اور اس کا نام حیات جاوداں ہے۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت کیا ہے
اک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات (🗀🗎)

اقبال نے زماں کو اپنے کئی اشعار میں موضوع بنایا ہے ان کا مقصد یہ واضح کرتا ہے کہ جس طرح حیوانات یا نباتات کے لیے تقدیر کی پابندی ہے اور ان کی زندگی جبر کے اصولوں پر متعین ہے اس طرح حیوانات اور نباتات کے لیے زمان مسلسل ہے جس کے وہ پابند ہے لیکن اگر انسان زمان مسلسل میں الجھ کر رہ جائے یعنی ساری زندگی کھانے پینے سونے جاگنے میں گزار دے تو اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہ رہے گا اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خودی میں ڈوب کر کسی اور زمان (یعنی زمان خالص) کو ڈھونڈ نکالے۔

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکان اور بھی ہیں (🗁🗎)

اقبال حقیقی زماں کی تعریف میں عراقی کے ہم خیال ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اقبال کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو اس کا سمجھنا مشکل ہے لیکن اگر انسان اپنے باطن پر غور کرے تو یہ بات واضح ہو جائے گئ کہ جس چیز کو وہ اپنی زندگی سمجھا ہے وہ دراصل زمانہ ہی ہے۔

اقبال زمان و مکان کے مسئلے کو مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ اس لیے سمجھتے ہیں کہ مسلمان زمانے کو محض روز و شب کے پیمانے سے ناپتے ہیں یعنی وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ کھانا پینا اور سونا جاگنا ہی زندگی ہے اقبال کے نزدیک ایسی زندگی حیوانوں کی زندگی ہے جو زمان کی اصل حقیقت سے ناواقف ہیں۔ لیکن اگر ان کی خودی صحیح معنوں میں بیدار ہو اور انھیں زمان خالص کا احساس ہو جائے تو ان کی تخلیقی قوت لحظہ بھر میں ایک نئی دنیا وجود میں لا سکتی ہے۔

زمان و مکان کی قید سے ان کی آزادی عین منشائے الٰہی ہے اور یہی مقصد حیات ہے آدم کو اسی لیے تخلیق کیا گیا کہ وہ ساری کائنات کو مسخر کرے اور زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہو جائے لیکن وہ خرد کے طلسم میں گرفتار ہو کہ اپنی اصل منزل سے غافل ہو گیا ہے۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ (🗎🗎)

اثبات وجود باری تعالیٰ:

اقبال کا تصورِ خدا جامد، غیر متحرک اور مجرد ہستی نہیں بلکہ فعال، تخلیقی اور حیّ و قیّوم ہے۔ وہ خدا کو محض علتِ اولیٰ نہیں مانتے بلکہ ایک زندہ ارادہ (Living Will) تصور کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک: خدا کائنات سے الگ نہیں، مگر کائنات میں حلول بھی نہیں کرتا، یہ تصور توحیدِ زندہ (Dynamic Monotheism) کہلاتا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے اپنے خطبات میں مسئلۂ اثباتِ وجودِ باری تعالیٰ کو محض روایتی منطقی دلائل تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے جدید فلسفیانہ تناظر میں ایک ہمہ گیر فکری مسئلہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا کا تصور کسی جامد مابعد الطبیعی مفروضے کا نام نہیں، بلکہ ایک زندہ، فعّال اور تخلیقی حقیقت ہے جو

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue No: 03 (2025)

کائنات، انسان اور تاریخ میں مسلسل جلوہ گر ہے۔ اسی لیے وہ وجودِ باری تعالی کے اثبات کے لیے محض نظری استدلال پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ انسانی تجربے، کائناتی عمل اور فطرتِ وجود کو بھی دلیل بناتے ہیں۔ اس فکری حکمتِ عملی کے تحت اقبال خدا کی ذات، خدا کے عمل اور خدا کی فطرت کو تین باہم مربوط جہتوں کے طور پر سامنے لاتے ہیں، جن کے ذریعے تصورِ خدا عقلی، تجربی اور وجدانی سطحوں پر یکجا ہو جاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک خودی مطلق ذات فطرت اور عمل کی نوعیت کیا ہے؟یعنی اقبال کے ہاں خدا کی ذات کا تصور کیا ہے؟اس کی فطرت کا تصور کیا ہے؟ اور اس کے عمل کا تصور کیا ہے؟

خدا کی ذات: جہاں تک ذات کا تعلق ہے تو اقبال اسے مکمل خودی کہتے ہیں۔اس کا کوئی جسم نہیں ہے نہ خلا میں اس نے مادہ کی شکل اختیار کی ہے نہ خلا میں اس کی ذات کا کوئی پھیلاو یا وسعت ہے لیکن بلا تجسیم وہ ایسی شخصیت خالص ہے جو اپنی تخلیقی فعلیت کے ممکنات میں جو اس کے وجود کے اندر مضمر ہیں لا متناہی ہیں یعنی اس کی ذات کی لا محدویت خلا میں مادے کی طرح وسیع و عریض نہیں ہے بلکہ روح یا شدت احساس تخلیقی کی ممکنات میں گہرائی کے اعتبار سے لا محدود ہے۔

خدا کی فطرت :اقبال کے خدا کی فطرت کا تصور کیا ہے ؟۔اقبال خدا کو خودی مطلق سمجھتے ہیں ان کے نزدیک خودی مطلق سے مراد انکشاف ذات ہے یا جوہر خودی کی نمود ہے۔خودی مطلق کی فطرت کا تصور یہ ہے کہ اللہ تعالی کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی فعلیت کے لا متناہی ممکنات کو مسلسل منکشف کرتا چلا جائے۔

خدا کا عمل :خودی مطلق کے ہاں انکشاف ذات کی خاطر تخلیق کا کیا طریق کار ہے ؟اقبال فرماتے ہیں کہ یہ عمل دو قسم کی تخلیق پر مبنی ہے عمل دو طرح کے ہیں :ایک تو عالم خلق ہے، جس سے مراد پیدا کرنا ہے۔اور دوسرے قسم عالم امر ہے جس کے معنی حکم دینے یا ہدایت کرنا ہیں مثلاً کسی کائنات، کہکشاں یا نظام شمسی کو وجود میں لانے کا، عالم خلق کے زمرے میں آتا ہے۔لیکن اس میں اپنے مدار پر گردش کرنے، حرکت کرنے، تحلیل ہو جانے یا عدم وجود میں چلے جانے کا عمل عالم امر کے زمرے میں آتا ہے۔اقبال کا امتیاز یہ ہے کہ اپنے تصور خدا کو تصور انسان کے ساتھ جوڑتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ انسانی خودی خودی مطلق کا مظہر ہے۔ان کے نزدیک انسان مسلسل پیچ و تاب کھاتا ہوا، متجسس، بے تاب، بے چین اور بے قرار ہستی ہے۔ اقبال اسے خدا کی طرح مگر محدود حد تک ایک تخلیقی فعلیت سمجھتے ہیں۔اس کی خودی محدود کا اصل مقصد بھی انکشاف ذات یا جوہر خودی کی نمود ہے، اس لیے لازم ہے کہ وہ مسلسل تحقیق تخلیق اختراع اور ایجاد کے عمل میں منہمک رہے۔اگر ایسا نہیں تو اس کی خودی بے نمود ہے تو اقبال کے نزدیک اس کا وجود نہ ہونے کے برابر یا مشتبہ ہے۔

اثبات عالم کون ومکاں:

اقبال کے نزدیک کائنات ابھی نا تمام ہے اور اس میں خالق و قادر مطلق اضافے کرتا رہتا ہے۔سو تقدیر سے مراد وہ زمانہ ہے جس کا ایک انکشاف مستقل میں بھی ہوتا ہے۔خدا عالم کل اسی اعتبار سے ہے کہ اس کے علم میں وہ سب امکانات موجود ہیں جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں، ہو سکتا ہے نہ آئیں۔پس زمانے کی حرکت کا تصور جو اقبال کے ہاں ملتا ہے، ایک پہلے سے کھنچے ہوئے خط کی شکل میں نہیں، کیوں کہ یہ خط ہر انسان خود اپنے لیے ابھی کھینچ رہا ہے۔اقبال کے خیال میں چوں کے پہلے سے کسی حتمی طور پر متعین مستقبل کا وجود ممکن نہیں۔اس لیے مستقبل کے متعلق خداوند تعالیٰ کا علم امکانات اور تقدیرات کی صورت میں لا متناہی ہے۔ مگر انسان نے اس کائنات میں اپنے امکانات اور قوی کو بروئے کار لاتا ہے،اس لیے کہ وہ

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 **Issue No:** 03 (2025)

اس دنیا کے میدان عمل میں وارد ہو کر بھی آزادی عمل کا حق نہیں رکھتا ہے یا مجبور محض یا اپنے مقدر کا پابند ہے۔اس کائنات کی تخلیق کا عمل ایک مخصوص گزشتہ واقعہ ہے۔خدا نے کن کہا اور یہ کائنات ہوگئی۔اگر کائنات کو بہ نفسہ موجود اور مکمل تصور کر لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کی حیثیت خدا کی زندگی میں ایک اتفاق سے زیادہ نہیں اگر یہ اتفاق واقع نہ ہوتا تو یہ کائنات وجود ہی میں نہ آتی اس نظریہ سے خدائی تخلیقی آزادی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ

"کل یومٍ ھو فی شأن"(23)

"خدا ہر روز اپنے آپ کو کسی نئے کام میں مصروف رکھتا ہے۔"

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کا تخلیقی عمل اب بھی جاری ہے۔جدید سائنس کے نظریہ اضافیت نے بھی یہ طے کر دیا ہے کہ یہ کائنات کوئی ٹھوس شے نہیں ہے بلکہ باہم متعلق واقعات کا ایک نظام ہے جس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اثبات ذات:

علامہ اقبال کی رائے میں انسان کی خودی ہی وہ اصل جوہر ہے، جس کی صحیح پرورش اور تعلیم و تربیت پر انسان کے اشرف خلائق ہونے کا دارومدار ہے۔

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است (24)

(نقطہ ءنوری جس کا نام خودی ہے؛یہی ہمارے بدن میں زندگی کا شرر ہے۔)

یہاں اقبال خودی کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خودی اپنی ہیئت و حقیقت کے اعتبار سے نور ہے،،اور اپنی فعلیت کے اعتبار سے نار ہے،جو زندگی کی چنگاری ہے۔نور حرکت کا باعث بنتا ہے اور نار حرارت کا۔اقبال کا پورا فلسفہ حرکت اور حرارت کے گرد گھومتا ہے،اور یہ دونوں عناصر زندگی کے لیے لازم ہیں۔اقبال کے نزدیک خودی کا معنی شخصیت ہے،ہر شخص کو قدرت کی طرف سے کچھ صلاحیتیں ملی ہوتی ہیں جن سے وہ خود بھی پوری طرح واقف نہیں ہوتا ان صلاحیتوں اور لیاقتوں کے مجموعے کو خودی کہا جا سکتا ہے۔کیوں کہ انھی کے سبب انسان کی شخصیت متعین ہوتی ہے۔جس انسان نے اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو سمجھ لیا اس نے گویا زندگی کا راز پا لیا ان صلاحیتوں کی دریافت گویا اثبات خودی ہے۔یہ صلاحیتیں اور استعدادیں کروڑوں اربوں انسانوں میں بھی ایک جیسی نہیں انھی کی مجموعی ترکیب سے ہر شخص کی ذات ایغو یا خودی تشکیل پاتی ہے اور اپنی جگہ پر لاثانی و منفرد ہوتی ہے۔جس شخص کی صلاحیتیں غیر ترقی یافتہ رہ گئیں اس کی خودی خوابیدہ و خام ہے۔

شخصیت ان کی عزیز ترین متاع ہے جو زندگی کے قوی احساس (جیسے تناؤ کی حالت کہتے ہیں) کے ہاتھ آتی ہے۔زندگی کے احساس کی شدت کم نہ ہو شخصیت کا قرار و دوام کا انحصار اسی شدت احساس اور تناؤ کی حالت پر ہے۔(25)

خودی،تعینات کے پردوں کے اندر مقید ہو کر ہی وجود پذیر یا محسوس و مشہود ہو سکتی ہے۔ایک مثال سے سمجھ آسکتی ہے کہ بجلی کیا ہے؟اس سے متعلق ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ حرکت محض ہے یا توانائی ہے لیکن جب یہ حرکت محض یا توانائی کسی شے کے اندر محصور ہو جاتی ہے تو ہم اس سے خود بجلی کا احساس کر لیتے ہیں اقبال فرماتے ہیں کہ خودی توانائی یا زندگی ہے وہ جب اپنے آپ کو متعین یعنی قید کر لیتی ہے تو پھر وہ منفرد یا مشخص ہو جاتی ہے۔

خیر و شر:

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

خیر و شر کی قوتیں اس دنیا میں موجود ہیں خودی جب استحکام کی طرف بڑھتی ہے تو کچھ قوتیں اس کی معاونت کرتی ہیں اور کچھ اس کی مزاحمت، استحکام خودی میں جو چیزیں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں وہ خیر کے زمرے میں شامل ہیں اور جو چیزیں سد راہ بنتی ہیں وہ شر کے ذیل میں آتی ہیں۔ بعض مفکرین کا خیال تھا کہ دنیا میں ہر طرف شر ہی شر ہے۔ خیر نہ ہونے کے برابر ہے اور اسے صرف کوشش ہی سے وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ گویا شر ایجابی ہے جو دنیا میں ہر جگہ موجود اور انسان کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ خیر سلبی ہے اور اسے وجود میں لانے کے لیے کوشش کرنی ہوتی ہے۔ شوپنہار دنیا کو آلام و مصائب سے معمور بتاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہاں رنج و غم کی فراوانی ہے اور خوشی کا فقدان ہر جگہ بدی نیکی پر غالب ہے۔ محمد بن ذکریا اور امام رازی بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن بیشتر مفکرین کی رائے اس کے برعکس ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کا کمال اس میں ہے کہ وہ خیر کی قوتوں سے خود کو مستحکم کرے اور جو چیزیں اس استحکام کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں، یعنی شر کی قوتیں، ان کا مقابلہ کرے۔ ان قوتوں کو زیر کر لینے کے بعد انسان کی خودی مستحکم ہو جاتی ہے اور انسان عشق، جہد و عمل، یقین محکم اور فقر و استغنا کی منزلوں سے گزر کر اور شر کی قوتوں پر فتح پا کر اور مرشد کامل کا اتباع کر کے مرد کامل کے درجے پر پہنچ جاتا ہے۔

عقل اور وجدان:

اقبال عقل کے منکر نہیں بلکہ عقلِ محض کے نقائص کے ناقد ہیں۔ ان کے نزدیک: عقل جزوی حقیقت تک پہنچتی ہے۔ وحی کلی حقیقت کی رہنمائی کرتی ہے۔ وجدان (Intuition) ان دونوں کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ یوں اقبال علمِ کلام میں عقل، وحی اور تجربے کو یکجا کر دیتے ہیں۔ اقبال کی شہرۂ آفاق تصنیف "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" جدید اسلامی علمِ کلام کا منشور ہے۔ اس میں وہ: جمود کے قائل نہیں، اجتہاد کو اسلامی نظام کی روح قرار دیتے ہیں فقہ، فلسفہ اور تصوف کو نئی تعبیر دیتے ہیں۔ یہ کتاب محض علمی نہیں بلکہ تہذیبی بیداری کا اعلان ہے۔ دراصل اسلامی فکر کی تجدید ہے۔ وہ نہ تو روایت سے منقطع ہوتے ہیں اور نہ مغرب کے سامنے مرعوب۔ ان کا کلامی نظام قرآن، جدید سائنس، فلسفہ اور انسانی تجربے کا حسین امتزاج ہے۔ اقبال نے علمِ کلام کو مناظرے کی سطح سے اٹھا کر حیاتِ انسانی کی تعمیر کا ذریعہ بنا دیا۔

حوالہ جات

[illegible]۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، [illegible]ء، ص [illegible]
[illegible]۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص [illegible]
[illegible]۔ ایضاً، ص [illegible]
[illegible]۔ ندوی، مولانا عبدالسلام، امام رازی، ادارۂ اسلامیات، لاہور، [illegible]ء، ص [illegible]
[illegible]۔ وحید الدین۔ اسلامی فکر کی تشکیلِ نو: اقبال کی نظر میں، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، [illegible]ء، ص [illegible]
[illegible]۔ برنی، سید مظفر حسین، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، اردو اکادمی، دہلی، [illegible]ء، ص [illegible]
[illegible]۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص [illegible]
[illegible]۔ برنی، سید مظفر حسین، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، اردو اکادمی، دہلی، ص [illegible]
[illegible]۔ متین، یونس (مرتب)، صحیفۂ اقبال، مشمولہ: اقبال اور جدید علمِ کلام (عبدالعزیز کمالی)، بزمِ اقبال، لاہور، [illegible]ء، ص [illegible]
[illegible]۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص [illegible]
[illegible]۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص [illegible]
[illegible]۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص [illegible]

QUALITATIVE RESEARCH JOURNAL FOR SOCIAL STUDIES
ISSN Online: 3006-4686, ISSN Print: 3006-4678
Volume No: 02 Issue **No:** 03 (2025)

🗁🗏۔ ایضاً، ص🗎🗏🗐

🗁🗐۔ عمر، سہیل؛ ہاشمی، رفیع الدین (مرتبین)، اقبالیات کے سو سال، مشمولہ: سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے مقالات، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص🗁🗐🖮

🗁🗄۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص🗏🗐🖲

🗁⌛۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص🗏🗎🖲

🗁🖮۔ ایضاً، ص🗏🗏🗀

🗁🖰۔ ایضاً، ص🗏🗏🗁

🗁🖲۔ اقبال، علامہ محمد، تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ (ترجمہ: سید نذیر نیازی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص🗏🖲

🗎🗀۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص🗏🗐🗀

🗎🗁۔ ایضاً، ص🗎🖲🖰

🗎🗎۔ ایضاً، ص🗎🗏🗀

🗎🗏۔ القرآن الکریم

🗎🗐۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ص🗎🗀🖲

🗎🗄۔ اقبال، علامہ محمد، شذراتِ اقبال (ترجمہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی)، بزمِ اقبال، لاہور، 🗁🖲🖮🖮ء، ص🖰🖮